Date of Publication: 02-01-2014 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 Jan. 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 January 2014 ۸ تا ۱۴ر جنوری ۲۰۱۴ء

Issue: 2, Vol :73 شمارہ نمبر:۲، جلد نمبر:۷۳

مصحفی امروہہ، آنولہ، دلّی اور لکھنؤ میں

ڈاکٹر الف ناظم (امن گیسٹ، ابوبکر نگر، دیوریا 274001، یوپی)

پہلی قسط

مصحفی کی جائے پیدائش و سنہ پیدائش کے بارے میں تذکرہ نگاروں اور محققین کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ خود مصحفی کے بیانات بھی اس اختلاف کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اپنی سنہ پیدائش کے بارے میں انھوں نے کوئی واضح اشارہ نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس عہد میں شعرا عموماً انہیں کے معاملے میں نہایت غیر محتاط ہوا کرتے تھے، نیز ان میں آج کے شعرا و ادبا کی طرح تحقیقی شعور نہ تھا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ کسی شخص کی پیدائش کو یاد رکھنے کے لیے اسے کسی اہم واقعے سے جوڑ دیا کرتے تھے۔ مصحفی نے اگرچہ نظم و نثر میں متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں لیکن کہیں بھی انھوں نے اپنی زندگی کے اہم واقعات کو تفصیل سے نہیں لکھا۔ اپنے تذکرے 'ریاض الفصحا' میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میرے حسب نسب کا حال 'مجمع الفوائد' سے معلوم ہوگا۔ ایک مدت تک مصحفی کے اس رسالے کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا۔ محققین نے اسے تلاش کر کے جب شائع کر دیا تو اس میں بھی وضاحت کے ساتھ کچھ نہ ملا۔

نے کسی سنہ کا حوالہ نہیں دیا۔

تذکرہ 'ریاض الفصحا' میں، جو ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۰ء میں مکمل ہوا، اپنی عمر ۸۰ سال کے قریب بتاتے ہیں اور دیوان ششم کے دیباچے میں، جو ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء میں تمام ہوا، اپنی عمر ساٹھ سال سے تجاوز لکھتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی ولادت احمد شاہ کے عہد سلطنت میں ہوئی۔

''تولدِ من در احمد شاہ است۔ تا الیوم عمرم از شصت متجاوز خواہد بود۔''

احمد شاہ ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء کو تخت نشین ہوا اور ۱۱۶۷ھ/ ۲ر جون ۱۷۵۴ء کو اس کا دورِ حکومت ختم ہوا۔ اس بیان کے پیش نظر امیر احمد علوی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مصحفی کی ولادت احمد شاہ کے دورِ حکومت یعنی ۲ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ/ ۱۹ اپریل ۱۷۴۸ء کے قریب سمجھنا چاہیے

مولانا حسرت موہانی نے سب سے پہلے مصحفی کے کلام کا انتخاب شائع کیا۔ یہ انتخاب اگرچہ اجمالی نوعیت کا ہے لیکن اس وقت تک مصحفی کا سارا کلام دستیاب نہ ہو سکا تھا، اس لیے اس کی بہت اہمیت تھی۔ ہمارے بہت سے ناقدین نے اسی انتخاب کی بنیاد پر اپنی اپنی تنقیدوں کی دیواریں کھڑی کی ہیں۔ اس انتخاب کے دیباچے میں حسرت نے مصحفی کی جو سنہ ولادت طے کی وہ عرصے تک موضوعِ بحث رہی۔ مولانا کے مطابق مصحفی کی سنہ ولادت ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء ہے مگر مولانا

مگر یہ مان لینا درست نہیں کہ ان چھ برسوں میں سے کس برس ان کی ولادت ہوئی۔ خود مصحفی کے بیانات کے مطابق ان کی سنہ ولادت ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء تسلیم کی جا سکتی ہے۔ سنہ ولادت کے حوالے سے اب تک محققین نے جو بیانات پیش کیے ہیں ان کے پیش نظر مصحفی کے اس بیان کو اعتبار حاصل ہے لیکن مصحفی کے بعض دوسرے بیانات سے اس کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔

اپنی عمر کے سلسلے میں مصحفی کا سب سے واضح اشارہ دیوان ششم کے دیباچے میں موجود ہے جس میں وہ اپنی عمر ساٹھ سے تجاوز ظاہر کرتے ہیں۔ اس طرح اگر ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء کو سال ولادت مان لیا جائے تو اس وقت ان کی عمر تریسٹھ برس (یعنی ساٹھ سے متجاوز) ہوتی ہے کیوں کہ دیوان ششم ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء

میں تمام ہوا۔

مصحفی ساٹھ برس تک بھی پاؤں چلے
ہم نے دیکھے ہیں زمانے کے چلن کیا کیا کچھ

مصحفی جب دوسری مرتبہ لکھنؤ آئے اس وقت ان کی عمر تیس برس رہی ہوگی کیوں کہ 'ریاض الفصحا' میں مصحفی نے ۳۰ سال کی عمر میں دلی سے ہجرت کا ذکر کیا ہے۔ 'مجمع الفوائد' میں بھی لکھا ہے کہ لکھنؤ آئے ہوئے (دوسری مرتبہ) ۳۰ برس سے زیادہ گزر گئے۔ دوسری بار لکھنؤ پہنچنے کا سال ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۳ء ہے۔ اس طرح 'مجمع الفوائد' ۱۲۲۸ھ/ ۱۸۱۳ء کے آس پاس کی تصنیف ٹھہرتی ہے یعنی ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء کو سال ولادت مان لیا جائے تو اس وقت ان کی عمر تریسٹھ برس کی ہوتی ہے۔ ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء میں انھوں نے لکھنؤ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر اسی برس کے آس پاس

تھی۔ اپنے آخری دیوان میں بھی مصحفی اپنی عمر اسی برس بتاتے ہیں:

قریب سال آ پہنچی ہے کشتی
غنیمت ہے کوئی دم زندگانی
ہمیں اے مصحفی اسّی برس میں
نہیں اب اعتبارِ عمرِ فانی

(دیوان ششم، غزل ۲۲، شعر ۱۵۱۶)

دراصل اس زمانے میں تذکرہ نگاروں کے نزدیک پانچ سات برس کا فرق کچھ زیادہ فرق نہ ہوا کرتا تھا۔ خود مصحفی اس معاملے میں نہایت غیر محتاط تھے، مثلاً شاہ ظہور الدین حاتم کی تاریخ تولد ان کے تاریخی نام 'ظہور' سے نکلتی ہے جس کے مطابق ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء ہوتی ہے۔ مصحفی 'عقد ثریا' میں جو فارسی شاعروں کا تذکرہ ہے، لکھتے ہیں رمضان المبارک ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء میں حاتم نے انتقال کیا۔ اس طرح حاتم کی عمر ۸۶ برس ہوتی۔

لیکن تذکرہ ہندی میں انھی حاتم کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی عمر انتقال کے وقت قریب بہ صد یعنی سو برس کے لگ بھگ بتاتے ہیں جب کہ حاتم نے ۸۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ گویا دس یا پانچ برس کا فرق زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اسی طرح مصحفی نے اپنے ہم عصر اور سب سے بڑے حریف انشا کی تاریخ وفات پر ایک قطعہ فارسی میں کہا، جس سے تاریخ وفات ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۹ء برآمد ہوتی ہے جب کہ انشا کا انتقال ۱۸۱۷ء میں ہوا۔ قطعہ یہ ہے:

انشاء اللہ خاں کہ بود از فصحا
زین دار رفت جانب ملک بقا
چو نقش گشت مصحفی بے کم و کاست
اے وائے کہ مرد و قدر دان شعرا

لہٰذا مصحفی کی یادداشت پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرنا درست نہیں۔ اطہر صدیقی

امروہوی کے مطابق مصحفی کی سنہ پیدائش ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۱ء ہے۔ ان کے مطابق مصحفی کا دیوان سوم ۱۲۱۱ھ/ ۱۷۹۷ء میں مکمل ہوا چوں کہ اس دیوان میں شامل ایک شعر میں مصحفی نے عمر کے قریں بہ 'تسعین' ہونے اور ایک شعر میں 'منزل تسعین' کے نزدیک پہنچنے کی طرف اشارہ کیا ہے اس لیے ان اشعار سے سال ولادت کی تصدیق ہوتی ہے:

اے مرگ ہے منزل تسعیں بھی ہو چکا
اب تو مجھے عذاب سفر سے نکالیے
(دیوان سوم)

ہر چند سال عمر ہے تسعیں قریں ہوئے
جھگڑا نہ زندگی کا چکا مصحفی ہنوز
(دیوان سوم)

مصحفی کا دیوان سوم جیسا کہ مذکور ہوا کہ ۱۲۱۱ھ/ ۹۷-۱۷۹۶ء میں مکمل ہوا اور ظاہر ہے کہ دیوان چہارم اس کے بعد شائع ہوا ہوگا، پھر بھی اس میں درج ذیل اشعار شامل ہیں

ان بھروں اس کے کہ پھر دلی میں آیا مصحفی
ایک مدت کا یہ اپنے شہر کو آوارہ تھا

بارے پھر یک مصحفی تو آن پہنچا ہے تو کیا
چند مدت رہیو ابھی اے یار دلی دور ہے

جب کہ مصحفی کا دیوان سوم اور دیوان چہارم کے مکمل ہونے (۱۷۹۶ء) سے برسوں پہلے (۱۷۸۳ء) میں لکھنؤ آکر مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے اس کے بعد مصحفی کا دلی جانا کسی معتبر حوالے سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے بعد مذکورہ اشعار دیوان چہارم میں موجود ہیں۔ اسی طرح دیوان ششم جو ۱۸۰۹ء میں مکمل ہوا، اس میں ایک غزل کے مقطعے میں کہتے ہیں:

میاں مصحفی کیا خاک لگے دلی میں اب دل
یہ بستی کچھ اجڑ ایسی گئی کہ نہ پوچھو

اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مصحفی دلی میں موجود تھے جب کہ دیوان ششم جیسا کہ مذکور ہوا کہ ۱۸۰۹ء میں مکمل ہو چکا تھا، اس کے بعد دلی کوچ کرنے کے سلسلے میں مصحفی کے اشعار کا کوئی حوالہ بھی موجود نہیں ہے، اس لیے ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ اشعار دوران قیام دلی ہی کہے گئے ہوں اور ترتیب کے وقت ان کو بعد کے کلام میں شامل کر لیا گیا ہو۔ مصحفی کی ولادت کے سلسلے میں ان کے اشعار پر اعتبار کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا بے حد مشکل ہے، البتہ ۱۷۴۸ء زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

سنہ ولادت ہی کی طرح مصحفی کے آبائی وطن کے سلسلے میں بھی تذکرہ نگاروں کے مختلف اور متضاد بیانات ملتے ہیں۔ خود مصحفی نے اپنے رسالے 'مجمع الفوائد' میں اپنا مولد اکبر پور بتایا ہے۔ یہ اکبر پور کس طرح کی بستی تھی اور کہاں واقع تھی اس میں بھی تذکرہ نگاروں کے درمیان اختلاف ہے۔ میر حسن نے 'تذکرہ شعرائے اردو' میں یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ اکبر پور، دہلی سے متصل ہے جہاں مصحفی کی ولادت ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں

''مولدش اکبر پور کہ موضع است حوطن بزرگانش از قدیم متصل دہلی الحال در شاہ جہاں آباد بہ گوشہ عزلت بسری برد۔''

لکھنؤ میں مصحفی اور میر حسن برسوں ساتھ رہے۔ تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی اور میر حسن میں دوستانہ تعلقات تھے۔ 'تذکرہ ہندی' میں مصحفی نے لکھا ہے

''تا زندہ بود با فقیر بسیار رابطۂ دوستی درست داشت۔''

میر حسن نے بھی اپنا تذکرہ مصحفی کی حیات ہی میں لکھا تھا، اس لیے ممکن ہے کہ میر حسن نے مصحفی سے ان کے حالات بھی دریافت کیے ہوں۔ شاید اسی بنیاد پر امیر احمد علوی نے میر حسن کے بیان کو ہی مستند قرار دیا ہے، لیکن اب اس بات کو اعتبار حاصل ہو چکا ہے کہ مصحفی نے جس اکبر پور کو اپنا مولد قرار دیا وہ دہلی نہیں امروہہ سے متصل ہے۔ افسر صدیقی امروہوی نے لکھا ہے کہ میر حسن کے اصل مخطوطے میں امروہے کا ذکر ہے اور بعد میں الفاظ کی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

''یہ الفاظ 'تذکرۂ میر حسن' کے مخطوطے سے نقل کیے گئے ہیں جو انجمن ترقی اردو کراچی کتب خانہ خاص میں محفوظ ہے لیکن مطبوعہ نسخے میں بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اس طرح لکھا گیا ہے'

از بجائے امروہہ اکبر پور قصبہ ایست وطن بزرگانش از قدیم متصل دہلی الحال در شاہجہاں آباد بہ پیشۂ تجارت می برد۔''

مولانا امتیاز علی عرشی نے بھی تذکرۂ میر حسن کے قلمی نسخے کے حوالے سے، جو رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہے، بتایا ہے کہ تذکرے کی اصل عبارت میں متصل کے بعد لفظ دہلی نہیں ہے یعنی اکبر پور امروہہ کے متصل ہے۔

تمام تذکرہ نگاروں نے مصحفی کا مولد اکبر پور ہی کو قرار دیا لیکن اسے دہلی اور امروہے سے متصل کہا گیا۔ امروہہ کے ایک بزرگ تقی حسن نے اس سلسلے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، انھوں نے 'مجمع الفوائد' کے حوالے سے لکھا ہے،

''مصحفی نے جس اکبر پور کا ذکر کیا ہے وہ 'اکبر پور پٹی' متصل امروہہ ہے۔ اس کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ امروہہ کے مضافات میں موضع اکبر پور تھماولی اور موضع شیخ پورہ نیز موضع گھوارلو ملکانو والا آج بھی موجود ہے اور ان کی جغرافیائی پوزیشن ٹھیک وہی ہے جو مصحفی نے بیان کی ہے (مجمع الفوائد میں) یعنی اکبر پور پٹی، تھماولی، شیخ پورہ اس طرح واقع ہیں کہ اکبر پور پٹی، تھماولی اور شیخ پورہ کے درمیان ہی آتا ہے۔ اکبر پور پٹی امروہہ سے ڈھائی تین میل کے فاصلے پر شمال و مغرب کے گوشے میں واقع ہے۔ اکبر پور کسی زمانے میں محلہ کالی پگڑی کے شیوخ کلاں کی جائداد میں تھا۔ مصحفی کلال تھے اس لیے یہ نتیجہ خود بخود برآمد ہوتا ہے کہ اکبر پور پٹی مصحفی اور ان کے اجداد کی جائداد میں تھا۔''

تقی حسن امروہے کے رہنے والے تھے، انھوں نے نہ صرف اکبر پور کی جغرافیائی پوزیشن دریافت کی بلکہ 'مجمع الفوائد' میں مصحفی کی بیان کردہ پوزیشن سے موازنہ بھی کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اکبر پور جو مصحفی کا مولد ہے، دراصل متصل دہلی نہیں بلکہ متصل امروہہ ہے۔ اس لیے تقی صاحب کے بیان کو زیادہ اعتبار حاصل ہے۔ یہ بیان افسر صدیقی اور امتیاز علی عرشی کے اس بیان کو اور پختہ کرتا ہے کہ میر حسن کے اصل نسخے میں یقینی طور پر کچھ الفاظ میں تبدیلی ہے اور یہ تبدیلی حقیقت پر پردہ ڈال کر اشتباہ میں مبتلا کرتی ہے۔ مرزا علی لطف نے 'گلشن ہند' میں لکھا ہے:

''مصحفی تخلص، غلام ہمدانی نام، ساکن امروہہ، اپنی قوم کا اشرف ہے۔''

غلام مصطفیٰ خاں شیفتہ نے لکھا ہے:

''مصحفی نے عنفوان شباب سے شاہجہاں آباد میں اقامت اختیار کی۔'' (یعنی اس سے قبل امروہہ میں تھے)۔

عبدالغفور نساخ نے لکھا ہے

''مصحفی تخلص، غلام ہمدانی، باشندۂ امروہہ ضلع مرادآباد۔''

محسن علی محسن نے تذکرہ 'سراپا سخن' میں لکھا ہے:

''مصحفی ولد ولی محمد باشندۂ امروہہ، مقیم لکھنؤ۔''

ان بیانات سے یہ واضح ہے کہ مصحفی کا تعلق امروہہ سے ہے اور جو دہلی کے بجائے مرادآباد سے زیادہ نزدیک ہے۔ ان بیانات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان تذکرہ نگاروں کے پیش نظر میر حسن کا اصل نسخہ رہا ہوگا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، جس میں متصل کے بعد لفظ دہلی نہیں ہے۔ امیر احمد علوی کے پیش نظر غالباً میر حسن کا اصل نسخہ نہیں رہا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ وہ اکبر پور کو متصل دہلی قرار دینے کے لیے بضد نظر آتے ہیں۔ امروہہ دہلی سے صرف ۸۱ میل (134 کلومیٹر) پر دہلی سے ہوڑہ روٹ پر واقع ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض تذکرہ نگاروں نے امروہے کو مضافات دہلی میں شمار کیا ہے۔

'مجمع الفوائد' میں مصحفی نے اپنے حسب نسب پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے باوجود اپنے آبائی وطن کے سلسلے میں وضاحت سے نہیں لکھا۔ محققین کو گمان یہ تھا کہ 'مجمع الفوائد' میں مصحفی نے چوں کہ حسب نسب تحریر کیا ہے تو وطن کے بارے میں بھی تفصیل سے تحریر کیا ہوگا۔ لیکن اس کتاب کے چھپنے کے بعد بھی آبائی وطن کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرنا دشوار ہی رہا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سید تقی حسن نے یہ قیاس کیا،

''اکبر پور میں کچھ پرانی قبریں بھی موجود ہیں جن کے متعلق خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ مصحفی کے جد اعلا شیخ نظام، ان کے والد اور ان کے بیٹے، پوتوں کی قبریں ہیں۔''

خود مصحفی نے کئی جگہ اپنے اشعار میں خود کو دہلی والا کہہ کر مزید الجھاؤ پیدا کر دیا ہے:

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی
میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

اور بھی بہت سے اشعار ہیں جن میں آبائی وطن، تاریخ ولادت وغیرہ کے بارے میں اشارے ملتے ہیں مگر ان اشاروں سے کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہے، البتہ اب تحقیق ہو چکی ہے کہ ان کا آبائی مولد اکبر پور ہی ہے۔ 'مجمع الفوائد' میں بھی انھوں نے اپنا مولد اکبر پور بتایا ہے اور یہ اکبر پور نامی گاؤں (جس کو بعض تذکرہ نگاروں نے قصبہ بھی لکھا ہے) آج بھی امروہے کے شمال مغرب میں موضع شیخ پورہ اور تھماولی کے درمیان واقع ہے۔ امروہہ کے گرد و نواح میں چوں کہ کئی اکبر پور موجود ہیں لیکن جس اکبر پور کی نشان دہی مصحفی نے کی وہ 'اکبر پور پٹی' کہلاتا ہے۔ اکبر پور کے نزدیک ایک چھوٹی سی بستی 'تھوارہ ملکانو' بھی ہے جس کا ذکر مصحفی نے 'مجمع الفوائد' میں کیا ہے، اسی سے یہ ثبوت ہو جاتا ہے کہ اکبر پور پٹی ہی مصحفی کا مولد ہے۔ حالاں کہ افسر صدیقی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مصحفی کے مورث اعلا شیخ نظام کا تکیہ مقبرہ اکبر پور پٹی متصل امروہہ کے بدلے اس اکبر پور کی نشان دہی کر رہا ہے جو دریائے جمنا کے کنارے پر کسی وقت واقع تھا اور اس وقت تک اس کا کوئی نشان باقی ہے نہ نام۔ افسر صدیقی نے سید تقی حسن کے اس بیان کی بھی تردید کی جس میں انھوں نے مصحفی کا مولد امروہہ بتایا ہے۔ افسر نے عبدالقادر خاں رام پوری کے اس بیان سے اتفاق کیا ہے جس میں انھوں نے مصحفی کا مولد بلب گڑھ قرار دیا ہے اور اسے نا اہل تردید کہا۔ اس سے متعلق انھوں نے دو ثبوت پیش کیے، ایک یہ کہ عبدالقادر خاں رام پوری نے خود مصحفی سے سنا کہ ان کا مولد بلب گڑھ ہے اور جو شاہجہاں آباد (دلی) سے متصل ہے۔ دوسرا یہ کہ اسے ایک ایسے روزنامچہ نویس کا بیان بتایا ہے جسے مصحفی سے نہ کوئی ذاتی پرخاش تھی اور نہ ان سے مراسم اتحاد رکھتے تھے۔ جہاں لکھنؤ کے دوسرے ارباب کمال سے ملاقات رکھتے تھے وہیں انھوں نے مصحفی سے بھی ملاقات کی۔ ممکن ہے کہ اکبر پور میں مصحفی کے اجداد کی زمین داری رہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی ولادت اکبر پور میں ہوئی ہو اور بعد میں ان کا خاندان نقل مکانی کر کے امروہہ میں آباد ہوا ہو۔ چوں کہ مصحفی کا بچپن امروہہ میں گزرا تھا، اس کی تصدیق خود مصحفی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ مصحفی کے خاندان کے لوگ امروہہ کے محلہ 'کالی پگڑی' میں رہتے تھے، جیسا کہ سید تقی حسن نے لکھا ہے کہ یہاں ان کے بزرگوں اور خاندان کے دیگر افراد کی قبریں ہیں۔ 'تاریخ اصغری' میں مولوی اصغر حسین نقوی مصحفی کے والد کے بارے میں لکھتے ہیں

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

دوسری اور آخری قسط

قومی یک جہتی کا بنیادی مسئلہ

پروفیسر علی احمد فاطمی (شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد)

ہندستان زبانوں کا نگارخانہ ہے۔ زبانوں کی آمد اور باہم میل جول سے نئی زبانوں کی پیدائش کی تاریخ بڑی پرانی ہے جس کی تفصیل کی اس وقت ضرورت نہیں۔ آزادی سے قبل ہندستان میں انگریزی کو ہی سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا لیکن اس وقت بھی زبانیں اپنے اپنے اعتبار سے ترقی کررہی تھیں۔ ہندستان کی کئی ریاستیں ایسی تھیں جہاں تین تین زبانیں بولی جاتی تھیں مثلاً حیدرآباد کی ریاست میں اردو، کنڑ اور تیلگو، بمبئی میں مراٹھی، گجراتی کے ساتھ ساتھ سندھی بھی بولی جاتی رہی ہے۔ یوپی بہار میں اردو ہندی اور مقامی بولیاں، پنجاب میں پنجابی، اردو، گرمکھی وغیرہ۔ ہر زبان کی اپنی انفرادیت متحدہ لسانی نظام میں باقی تھی خواہ وہ اپنے مخصوص لسانی جغرافیے میں ہو یا اس سے باہر لیکن ہندستان کے آزاد ہوتے ہی لسانی تقسیم کے ساتھ لسانی جغرافیے میں وہ زبانیں بری طرح مجروح ہونے لگیں جن کا کوئی نہ جغرافیہ تھا اور نہ صوبہ۔ اس سے لسانی تفریق کا جذبہ پیدا ہونے لگا اور محروم زبانیں مایوسی اور غصے کا شکار ہونے لگیں چناں چہ دیگر امور کی طرح زبانوں کی حمایت ومخالفت شروع ہوئی۔ یوپی میں ہندی اور مہاراشٹر میں مراٹھی کی حمایت میں نعرے بلند ہونے لگے۔ مختلف علاقائی اور سرکاری زبانوں کے آمرانہ طریقوں سے دوسری اقلیت کی زبانیں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگیں اور پھر ردعمل کے طور پر اپنے وجود اور شناخت کے لیے اکثریت کے مقابلے مرنے مارنے کو تیار ہوگئیں۔ اس سے یہی نتیجہ نکلا کہ دونوں سطح پر یہ زبانیں، اس کے بولنے والے اپنے اپنے مسائل میں ڈوب گئے۔ اور ہندستان، ہندستان اور اس کی قومی و لسانی یک جہتی سے دور ہوتے چلے گئے۔ ایک قوم اور ایک قومی شعور کا تصور مسخ ہوتا چلا گیا۔

۱۹۴۷ سے اب تک شعوری طور پر اس کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ جب بھی یہاں قوم کی بات چلی اس سے مراد ایک قوم، ایک زبان سے مراد ہندی، ہندستانی سے مراد ہندو لیا جانے لگا حالاں کہ یہ پورا نقطۂ نظر انتہائی گمراہ کن اور نقصان دہ تھا اور اب بھی ہے اس لیے کہ مسئلہ مذہبی یا فرقہ وارانہ نہیں ہے بلکہ قوم کا ہے۔ اگر ہندستان میں واقعی صرف ہندو بستے ہیں، صرف ہندی بولی جاتی ہے تو یہ تصور درست ہے لیکن حقیقت تو اس کے برعکس ہے۔ ہندستان میں بے شمار قومیں اور زبانیں ہیں تو ایسی صورت میں کسی ایک فرقے کو قومی تہذیب اور تاریخ کا امین اور وارث قرار دینا سراسر غلطی ہے اور آج ہم اس غلطی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ شعوری طور پر برتی ہوئی اس سیاسی و تہذیبی تفریق نے ملک اور ملک کے عوام کو اس قومی شعور سے بہت دور کردیا جو کسی بھی ملک کی ترقی اور یک جہتی کے لیے مرکزی خیال اور جذبے کا کام کرتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ملک نے ساٹھ پینسٹھ برسوں میں ترقی نہیں کی تو غلط ہوگا۔ سائنسی اور صنعتی اور دوسرے میدانوں میں ملک نے واقعتاً ترقی کی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک غلامی کو بہت پیچھے چھوڑ آنے کے باوجود آج بھی وہ امیر غریب، طبقاتی جدوجہد، متوسط طبقہ غرض کہ پورا ملک اور اس کا اقتصادی ڈھانچہ چند سرمایہ داروں کے جال میں جکڑا ہوا ہے۔ ان پر بھی ملٹی نیشنل کا قبضہ ہے۔ ہندستان ہزار جمہوریت میں ہو لیکن اس کا کوئی بھی الیکشن، لیڈر، حد یہ کہ اب اخبارات اور ٹی وی کے چینلز بھی سرمایہ داروں کے قبضے میں ہیں۔ انھی لوگوں کو فرقہ پرست لیڈر موافق آتے ہیں کہ ان کی تجارت اور معیشت میں فرقہ واریت راس آتی ہے۔ جس ملک میں صرف کچھ لوگ ہی راج کررہے ہوں کیا اسے مکمل صنعتی انقلاب کہا جاسکتا ہے۔ جہاں فرقہ پرست، فسطائی جماعتیں ملک کی سیاست، جمہوریت کا راستہ طے کریں اسے مکمل آزادی کہا جاسکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں — صنعتی انقلاب تو اپنے دامن میں کشادگی اور خوشحالی لاتا ہے جیسا کہ مغرب میں آیا۔ آج کا ہندستان تو ہر اعتبار سے بحران میں جلتا ہے۔ مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے، رشوت خوری جزو ایمان بن چکی ہے، لاقانونیت قانون بن چکی ہے، عام انسانوں کا جینا محال ہوگیا ہے، نوجوانوں کے لیے ملازمت نہیں ہے، تعلیمی ادارے، ملازمت کے ادارے حد یہ کہ انصاف کے ادارے تعصبات اور کرپشن کے ڈھیر بن چکے ہیں۔ پورے سماج کا شیرازہ بکھر چکا ہے، مستقبل اندھیرے میں ہے۔ تشدد کی بھرمار ہے۔ جب کسی قوم پر اتنی مصیبتیں ہوں اور اس کے باوجود وہ اس کے خلاف صف آرا ہونے کے بجائے کہیں نہ کہیں اس کی مشنری کا حصہ بن چکی ہو تو ایسے میں قومی یک جہتی کا تصور محال ہے — ایسا نہیں ہے کہ قومیں سو رہی ہوں یا ان کا ضمیر مردہ ہو چکا ہو تھوڑی سی بیداری اور جمہوری بیداری ان میں آئی ہے لیکن ان کی سمتیں موڑ دی گئی ہیں۔ شعور کی وہ اڑان جو کچل کر ملک و قوم کی دھڑکنوں میں انگڑائی لیتی ہے اس کے پنکھ توڑ دیے گئے ہیں اور ان کو اپنی ذات اور قوم کے قفس میں بند کردیا گیا۔ چناں چہ جب جب ان کو اپنی خودی اور خودشناسی پر ضرب پڑتی ہیں تو یہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، خواہ بابری مسجد کا مسئلہ، شاہ بانو کیس کا، رام جنم بھومی کا وغیرہ۔ وہ اپنی جان کی بازی تک لگا دیتے ہیں اور اپنے ملک و معاشرہ اور معیشت کو تباہ کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کرتے۔ ان بے بنیاد، نقصان دہ جھگڑوں میں پھنس جانے کی وجہ سے وہ ان بنیادی مسئلوں وضرورتوں سے بے خبر ہیں یا ان کے خلاف لڑنے کا جذبہ سب ہو چکا ہے یا کردیا گیا ہے جو کسی بھی ملک کی بہتری و خوش حالی کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔ حالاں کہ یہ جذبہ نہ صرف انسانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے بلکہ مشترکہ مقصد کے لیے اجتماعی جدوجہد کا ایک ایسا شعور ہے جو بصیرت و آگہی سے بھی دوچار ہوتا ہے اور ترقی و تبدیلی سے بھی اور تخریبی عناصر سے علاحدگی بھی ہوتی ہے۔ یہ جذبہ براہ راست عوامی ضرورتوں اور ان سے متعلق جدوجہد سے نکلتا ہے تو اس کے بطن سے عوامی یک جہتی کا ایسا نور پھوٹتا ہے جو اکثر پورے ملک اور سماج کو منور اور بیدار کردیتا ہے اس لیے کہ روزی روٹی، بجلی پانی کی لڑائی کسی ایک مذہب یا ذات کی لڑائی نہیں ہوتی، اس دھرتی پر زندہ رہنے والے عام انسانوں کی لڑائی ہوتی ہے جس کی صف میں بلا امتیاز مذہب و ملت سب آ کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کو اس دلدل سے نکال کر اشتراکی نظام کی اس جدوجہد میں لا کھڑا کرنے کی ہے۔ انھیں اپنی طاقت اور جدوجہد کے عرفان سے آشنا کرانے کی ہے۔ ملک کی اس سنگین صورت حال میں یہ کام اگرچہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کے برابر ہے لیکن یہ تو کرنا ہی ہوگا کہ آگ میں جلے بغیر کوئی قوم سونا نہیں بنتی۔

عوامی جدوجہد کی عالمی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ ہمیں بھی اس سے دوچار ہونا ہے کہ قومی یک جہتی کے آدرش وادی پاٹھ تو ہم بہت پڑھ چکے، اب ہمیں اس فطری عمل سے گزرنا ہوگا جو کسی بھی ملک کی سالمیت اور یک جہتی کے لیے کلیدی رول ادا کرتا ہے۔

•◆•

ہندستان زبانوں کا نگارخانہ ہے۔ زبانوں کی آمد اور باہم میل جول سے نئی زبانوں کی پیدائش کی تاریخ بڑی پرانی ہے جس کی تفصیل کی اس وقت ضرورت نہیں۔ آزادی سے قبل ہندستان میں انگریزی کو ہی سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا لیکن اس وقت بھی زبانیں اپنے اپنے اعتبار سے ترقی کررہی تھیں۔ ہندستان کی کئی ریاستیں ایسی تھیں جہاں تین تین زبانیں بولی جاتی تھیں مثلاً حیدرآباد کی ریاست میں اردو، کنڑ اور تیلگو، بمبئی میں مراٹھی، گجراتی کے ساتھ ساتھ سندھی بھی بولی جاتی رہی ہے۔ یوپی بہار میں اردو ہندی اور مقامی بولیاں، پنجاب میں پنجابی، اردو، گرمکھی وغیرہ۔ ہر زبان کی اپنی انفرادیت متحدہ لسانی نظام میں باقی تھی خواہ وہ اپنے مخصوص لسانی جغرافیے میں ہو یا اس سے باہر لیکن ہندستان کے آزاد ہوتے ہی لسانی تقسیم کے ساتھ لسانی جغرافیے میں وہ زبانیں بری طرح مجروح ہونے لگیں جن کا کوئی نہ جغرافیہ تھا اور نہ صوبہ۔ اس سے لسانی تفریق کا جذبہ پیدا ہونے لگا اور محروم زبانیں مایوسی اور غصے کا شکار ہونے لگیں چناں چہ دیگر امور کی طرح زبانوں کی حمایت ومخالفت شروع ہوئی۔

اردو دُنیا

صرف ہندی میڈیم کالج ہی کیوں

مغربی بنگال میں اردو دوسری سرکاری زبان، سرکاری سرپرستی سے ہنوز محروم

کلکتہ (۳۰ نومبر)۔ حکومت مغربی بنگال نے ہندی ذریعہ تعلیم کا اپنی نوعیت کا پہلا کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حکومت کے اس فیصلے سے ہندی والوں میں خوشی کی لہر ہے اور اس فیصلے کا خیر مقدم کیا جارہا ہے۔ مغربی بنگال میں اردو آبادی بھی تقریباً اہل ہندی کے برابر ہی ہے لیکن اردو والوں کو صرف مایوسی ہی ہاتھ لگی، حالاں کہ بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل چکا ہے اور ہندی سمیت دیگر زبانوں کو یہ درجہ ملنا ابھی باقی ہے۔ اردو حلقوں میں سوال اٹھ رہا ہے کہ آخر صرف ہندی میڈیم کالج ہی کا قیام کیوں؟ اردو سرکاری سرپرستی سے کیا اب بھی محروم رہے گی۔ واضح ہو کہ گزشتہ دنوں صوبائی وزیر تعلیم براتیہ باسو نے یہ اعلان کیا کہ شمالی بنگال میں ہندی میڈیم کا پہلا سرکاری کالج قائم کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ایک سات رکنی کمیٹی بھی بن چکی ہے جس کے چیئرمین شمالی بنگال یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں تو دوسری جانب کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ ہندی کے ایک پروفیسر کو بھی کمیٹی میں ممبر منتخب کیا گیا ہے۔ اس کے لیے جلپائی گوڑی میں زمین کی نشان دہی بھی کر لی گئی ہے۔ ڈی ایم بھی پیش پیش ہیں۔ خبروں کے مطابق آئندہ ۲۰۱۳-۲۰۱۴ سے کالج کا کام باضابطہ شروع کر دیا جائے گا۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ صوبہ مہاراشٹر جہاں سب سے زیادہ اردو میڈیم کے پرائمری، سکنڈری اسکول اور کالج اور بی ایڈ کالج بھی حکومت کے ماتحت قائم ہیں۔ آندھرا پردیش، کرناٹک اور دوسری ریاستوں میں بھی اردو ذریعہ تعلیم سے سرکاری بی ایڈ کالج کا انتظام ہے جب کہ مغربی بنگال میں بارہویں تک اردو میڈیم کے اسکولوں کے باوجود اردو ذریعہ تعلیم کا ایک بھی سرکاری بی ایڈ کالج نہیں ہے۔ این سی ٹی ای کے ضابطوں اور لازمی حق تعلیم قانون کی رو سے ۲۰۱۵ء تک تمام اساتذہ کو تربیت یافتہ (بی ایڈ) ہونا ضروری ہے۔ ایک ایسی ریاست جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے وہاں اردو والوں سے اس طرح کی ناانصافی افسوس ناک ہے۔

مارکسی دور حکومت میں سابق ڈپٹی اسپیکر و وزیر خوراک مرحوم کلیم الدین شمس نے بنگال میں اردو یونیورسٹی بنانے کا اعلان کیا تھا لیکن وہ بس اعلان ہی ثابت ہوا اور آج تک اس کی عملی تعبیر اردو والوں کو نہیں ملی۔ نئی حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد اردو والوں کے ساتھ وعدے تو بہت کیا جارہا ہے مگر ابھی تک عملاً کچھ نہیں کیا گیا۔ خصوصاً اردو کو اعلا تعلیم سے جوڑنے کے بارے میں ہمارے وزیر تعلیم نے سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

(اخبار مشرق، کلکتہ)

اردو داں حلقے میں بھی اردو نظر انداز

بورڈز اور ہورڈنگس سے اردو غائب

ارریا، بہار (۲۶ نومبر)۔ آر جے ڈی کے سابق رہنما اور سماجی کارکن سرور عالم نے اردو کے معاملے میں اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سیمانچل کے 50 فیصد سے زائد لوگ اردو بولتے اور پڑھتے ہیں، مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ نہ تو حکمراں جماعت اور نہ ہی دیگر سیاسی جماعتیں ہی اس پر توجہ دیتی ہیں۔ بڑی بڑی ریلیاں ہوتی ہیں مگر کبھی بھی کوئی پوسٹر یا فلیکس بورڈ اردو میں نہیں لگائے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، مرکزی اور ریاستی منصوبوں کے بڑے بڑے بورڈز پورے علاقے میں لگے ہیں مگر ایک بھی بورڈ اردو میں لگا گوارہ نہیں۔ سرور عالم نے کہا کہ یہ اردو بولنے والوں کے ساتھ کیسا انصاف ہے؟ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ بڑے بڑے رہنما اردو کے بغیر اپنی تقریر مکمل نہیں کر سکتے۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں ایک بڑی آبادی اردو بولتی ہے۔ صرف سرکاری دفاتر میں اردو میں نیم پلیٹ لگا دینے سے اردو کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا۔ آج میڈیا سے لے کر فلم انڈسٹری اردو کی محتاج ہے۔ ان کی کوئی بھی خبر اردو کے بغیر مکمل نہیں، پھر اردو کے ساتھ یہ سوتیلا رویہ کیوں؟ سرور عالم نے کہا کہ اردو اخبارات کے نمائندوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی سرکاری میٹنگ میں انھیں بلایا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، ماکارپی سے وابستہ خبریں بھی اردو اخبارات کو نہیں دی جاتیں۔ یہ حال ارریا، پورنیہ، کشن گنج، کٹیہار ضلعوں کا ہے۔ اردو اخبارات کے نمائندے اپنے ذریعے خبریں وصول کرتے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے ایس ڈی ایم کو میمورنڈم

رام پور (۱۹ نومبر)۔ امام جامع مسجد ٹانڈہ مولانا جلیس احمد کی قیادت میں تنظیم علما کے ایک وفد نے ایس ڈی ایم سنتوش بہادر سنگھ سے ملاقات کی اور انھیں وزیر اعلا کے نام ایک عرض داشت پیش کیا جس میں قصبہ ٹانڈہ کے کالجوں اور اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ وفد میں مفتی مظفر حسین، مولانا ریاض الحسن، مولانا محمد اسلام، مولانا احتشام الحق، مولانا عبدالحکیم، مولانا شاہد علی، مولانا محمد زاہد، مولانا محمد کاشف اور مولانا محمد افتخار وغیرہ نے وزیر اعلا کو بھیجے گئے میمورنڈم میں کہا ہے کہ گورنمنٹ انٹر کالج ٹانڈہ قصبے کے 21 بلاک اور 8 جونیئر اسکولوں میں ایک بھی اردو کا ٹیچر نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ محکمۂ تعلیمات کے افسران اردو والوں اور مسلمانوں کو حکومت سے ناراض کرنا چاہتے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو میڈیم اسکولوں میں سہولتوں کی فراہمی کا مطالبہ

نارائن پیٹ، آندھرا پردیش (۱۹ نومبر)۔ جناب رؤف حسام الدین (سکریٹری 'سوٹا') نے بتایا کہ سوٹا کی جانب سے ڈائرکٹر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش سے نمائندگی کرکے مطالبہ کیا گیا کہ اردو اکیڈمی کی طرف سے سرکاری اردو میڈیم اسکولوں میں انفراسٹرکچر کی فراہمی کے لیے درخواستوں کے ادخال کے لیے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کے دستخط کا جو لزوم رکھا گیا ہے اس کی بجائے متعلقہ منڈل ایجوکیشن آفیسر یا ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر کے ذریعے درخواستوں کو فارورڈ کیا جائے تو بہتر رہے گا کیوں کہ ایسے صدر مدرسین جو ضلع مرکز سے دور دراز کے فاصلوں پر رہتے ہیں، ان کا دفتر ڈی ای او پہنچنا اور بڑی تعداد میں متعلقہ ڈی ای او کے دستخط حاصل کرنا مشکل ہے۔ ڈی ای او کی دستخط کی شرط سے بہت سے سرکاری مدارس مالی امداد حاصل نہیں کر پائیں گے، نتیجتاً حکومت کی جانب سے سرکاری مدارس کو مستحکم کرنے کے مقصد سے جو فنڈ جاری کیا گیا ہے، وہ مکمل طور پر استعمال نہیں ہو پائے گا۔ اسٹیٹ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے قائدین جناب رؤف حسام الدین اور خلیل احمد نے ڈائرکٹر اردو اکیڈمی سے مطالبہ کیا کہ وہ انفراسٹرکچر کی فراہمی کی شرائط میں نرمی پیدا کریں۔

(سیاست، حیدرآباد)

نئے اردو کمپیوٹر سافٹ ویئر کی رسم اجرا

اردو ملک میں رابطے کی زبان ہے: مرکزی وزیر قانون کپل سبل کا بیان

نئی دہلی (۲۶ نومبر)۔ اس تاثر کو مسترد کرتے ہوئے کہ اردو زبان کا دائرہ مسلمانوں تک محدود ہے۔ مرکزی وزیر مواصلات کپل سبل نے آج یہاں کہا کہ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جسے ہندی، اردو اور انگریزی کی شکل میں ملک گیر سطح پر رابطے کی تین زبانوں سے مالا مال ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ٹی ڈی آئی ایل کے اشتراک سے قومی اردو کونسل کی اردو زبان کے لیے حسب حال کردہ ٹیکنالوجیوں اور ان کے اطلاق کے سافٹ ویئر کا اجرا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مجوزہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں اردو کا شعبہ نمایاں ہوگا۔ انھوں نے سائنسی اور تکنیکی محاذ پر اردو کے فروغ کو مہمیز لگانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہ ایک سنٹرل مانیٹرنگ کمیٹی بنانے پر زور دیں گے تاکہ روز افزوں متبادل ٹیکنالوجیائی منظرنامے پر اردو کہیں پیچھے نظر آئے۔ مسٹر سبل نے کہا کہ اردو کے تعلق سے ایک طرح سے ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے جس کے لیے وہ اپنی موجودہ وزارت کے ساتھ ان تمام وزارتوں، محکموں اور شعبوں خاص طور پر اردو کونسل کے ممنون ہیں جن کی اجتماعی کوششوں سے آج ہم یہاں کسی پیش رفت کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے یکجا ہوئے ہیں۔ کونسل کے سربراہ ڈاکٹر خواجہ اکرام نے اس انقلابی قدم کو مسلسل حسب حال بنانے یعنی اپ ڈیٹ کرنے پر زور دیا تاکہ رفتار زمانہ سے ہم آہنگی برقرار رہے۔ خواجہ اکرام نے اردو کو اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے لحاظ پر فروغ دینے خاطر خواہ دلچسپی لینے پر مسٹر کپل سبل کا شکریہ ادا کیا۔

(اعتماد، حیدرآباد)

سرکاری دفاتر کے سائن بورڈوں پر اردو ندارد

شادنگر، آندھرا پردیش (۲۷ نومبر)۔ اردو زبان جسے آندھرا پردیش کے پندرہ اضلاع میں دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے، اس کے باوجود اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک روا رکھا جارہا ہے۔ شادنگر کے سرکاری دفاتر ایم آر او آفس، ایم پی ڈی او آفس، پولیس اسٹیشن، سب رجسٹریشن آفس، کورٹ، ڈگری کالج، شادنگر ایریا ہاسپٹل اور آر ٹی سی بسوں کے سائن بورڈوں پر اردو تحریر کو نظر انداز کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ چند سال قبل جونیئر کالج میں انٹر (اردو میڈیم) کا بھی آغاز کیا گیا۔ اس کالج کے سائن بورڈ پر بھی اردو موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مستقر شادنگر میں 3 کروڑ 19 لاکھ روپے کی لاگت سے جدید تعمیر کردہ کورٹ بلڈنگ کامپلیکس کا چیف جسٹس آف آندھرا پردیش ہائی کورٹ کے ہاتھوں افتتاح عمل میں آیا تھا لیکن جدید کورٹ کے سائن بورڈ پر بھی اردو کو نظر انداز کر دیا گیا۔ سرکاری دفاتر کے سائن بورڈز اور آر ٹی سی بسوں پر اردو تحریر کو یقینی بنانے کے لیے متعدد مرتبہ عہدیداروں سے نمائندگی کی گئی لیکن عہدیدار اس معاملے میں لاپروائی برت رہے ہیں۔ شادنگر کے عوام نے ارباب مجاز سے اپیل کی ہے کہ وہ اس جانب فوری توجہ دیں۔

(اردو ایکشن، بھوپال)

ہریانہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام
علی سردار جعفری پر توسیعی لکچر کا انعقاد

پنچکولہ (پریس ریلیز) علی سردار جعفری کے 100ویں یوم پیدائش کے موقع پر ہریانہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام ایک توسیعی لکچر 'علی سردار جعفری اور ان کی ادبی خدمات' کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور ہندستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری پروفیسر علی احمد فاطمی نے توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے علی سردار جعفری کو جدید ہندستان کے معماروں میں شمار کیا۔ پروفیسر فاطمی نے کہا کہ سردار جعفری اردو کے ایسے قلم کار تھے جنھوں نے قلم کو ہتھیار بنایا اور ادب کو زندگی سے جوڑنے کے پریم چند کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ سردار جعفری نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ ایک تنقید نگار، ایک محقق، ایک صحافی اور مجاہد آزادی کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ پروفیسر فاطمی نے کہا کہ جب اردو زبان و ادب کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو علی سردار جعفری کو سر فہرست قلم کاروں میں شامل کیا جائے گا۔

علی سردار جعفری پر اس توسیعی لکچر کی خاص بات یہ تھی کہ اس لکچر کو سننے کے لیے ہریانہ اردو اکادمی کے اردو خط و کتابت کورس کے ایسے بہت سے طلبہ بھی تشریف لائے جو اردو زبان و ادب سے نہ صرف یہ کہ محبت کرتے ہیں بلکہ عملی طور پر اردو کو سیکھ کر اس سے اپنی وابستگی کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔

ممتاز ادیب اور ماہر عروض و لسانیات
ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کی رحلت پر اردو گھر میں تعزیتی جلسہ

نئی دہلی (۲۴ دسمبر)۔ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، محقق، ماہر عروض و لسانیات اور ماہر غالبیات ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کی کڈنی فیل ہو جانے کی وجہ سے 23 دسمبر 2013 کو رات 11.25 بجے دہلی کے اپولو اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں 24 دسمبر 2013 کو ایک تعزیتی جلسہ انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جلسے کے آغاز میں انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ پندرہ بیس دنوں سے وہ بیمار تھے، مگر چار دن قبل طبیعت زیادہ ناساز ہو جانے کی وجہ سے انھیں اپولو اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں انھوں نے 24 دسمبر کی شب میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے مزید کہا کہ کمال احمد صدیقی اردو کے معروف ادیب اور محقق تھے۔ علم عروض اور لسانیات کے حوالے سے اردو ادب میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے غالبیات میں بھی اپنے قابل قدر کارناموں کی وجہ سے وقیع اضافہ کیا۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اردو کی ایک کثیر الجہات شخصیت تھے۔ انھوں نے بہت سے علمی کام کیے۔ وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی وابستہ رہے انھوں نے طویل عمر پائی اور آخر دم تک وہ ادبی سرگرمیوں سے جڑے رہے۔ وہ بہت باحوصلہ انسان تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کمال صاحب کا کسی سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ وہ اپنے سے چھوٹوں کی اتنی ہی قدر کرتے تھے جتنی بڑوں کی قدر کرتے تھے۔ انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ ماس کمیونی کیشن میں بھی ان کو درک حاصل تھا۔ وہ عروض داں بھی تھے، نقاد بھی تھے اور شاعر بھی تھے، غرض یہ ہے کہ انھوں نے تمام زندگی ادب کی خدمت کی۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ کمال احمد صدیقی ایک انتہائی باصلاحیت ادیب تھے۔ انھوں نے ادب کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھیں اپنی صلاحیت اور لیاقت پر کوئی گھمنڈ نہیں تھا۔ ان کا غالب پر وقیع کام ہے اور اسی وجہ سے ان کا شمار ماہر غالبیات میں بھی ہوتا ہے۔ ایسی شخصیتیں بار بار نہیں پیدا ہوتیں، یقیناً ان کے چلے جانے سے اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔

جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ سے کمال احمد صدیقی کا بڑا گہرا تعلق تھا، انھیں غالب انعام سے سرفراز کیا گیا تھا، ان کی ایک کتاب 'غالب کی شناخت' غالب انسٹی ٹیوٹ نے چھاپی تھی، وہ ماہر غالبیات بھی تھے۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ادبی جلسوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور مستقل مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ان کے انتقال سے یقیناً اردو میں ایک خلا پیدا ہوا ہے۔

جناب سید شریف الحسن نقوی نے کہا کہ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے علم عروض اور غالبیات پر ایسا غیر معمولی کام کیا ہے جو انھیں ہمیشہ زندہ جاوید رکھے گا۔ ایسے ادیب اور اسکالر دنیائے اردو میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ وہ نہایت ہی منکسار اور بااخلاق انسان تھے۔

آخر میں جلسے کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ کمال احمد صدیقی صاحب ہمارے سب سے بزرگ ادیبوں اور شاعروں میں تھے۔ وہ ابتدا سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور صحافت میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ بیماری سے پہلے تک وہ دوستوں کی ادبی محفلوں میں بہت شوق اور انہماک سے شریک ہوتے تھے۔ سیمیناروں میں پڑھے گئے ان کے مقالات کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں سے بیشتر مقالے رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ خدا ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر عطا کرے۔

(رپورٹ: محمد عارف خاں)

بی ایڈ میں اردو کی سیٹیں دستیاب کرائی جائیں
دھنباد ٹیچرس ٹریننگ کالج کے ڈاکٹر قاضی شکیل ایکتا کی وزیر تعلیم کو عرض داشت

دھنباد (۲۶ دسمبر)۔ دھنباد ٹیچرس ٹریننگ کالج کے ڈاکٹر قاضی شکیل ایکتا نے وزیر تعلیم گیتا شری اوراؤں کو ایک عرض داشت پیش کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بی ایڈ کالجوں میں داخلے کے لیے سبجیکٹ کی مجبوری ختم کرے اور دیگر زبانوں کی طرح ہندی، انگریزی کی طرح اردو سبجیکٹ کی سیٹیں بھی دستیاب کرائی جائیں۔ شکیل ایکتا نے اپنی عرض داشت میں کہا کہ جھارکھنڈ میں تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے بی ایڈ کالج میں تربیت کو بہتر طریقے سے عمل میں لایا جائے۔ انھوں نے 6 نکاتی مطالبات پیش کیے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ دیگر ریاستوں کی طرح بی ایڈ کالجوں میں سیٹ کی مجبوری ختم کی جائے کیوں کہ سائنس سبجیکٹ میں طالب علم کے نہیں ملنے کے سبب بی ایڈ کالجوں میں سیٹیں خالی رہ جاتی ہیں۔ دیگر ریاستوں جیسے بہار، اڑیسہ، بنگال میں سیٹوں کی کمی نہیں ہے۔ اس لیے جھارکھنڈ میں بھی اسے ختم کیا جائے۔ جھارکھنڈ میں اردو زبان دوسری سرکاری زبان ہے اس لیے بی ایڈ کالجوں میں انگریزی اور ہندی کی طرح اردو زبان کے لیے بھی سیٹیں دستیاب کرائی جائیں۔

جھارکھنڈ اقلیتی بی ایڈ کالجوں میں اردو زبان کے طالب علم زیادہ ہیں لیکن ان کا اردو زبان میں داخلہ نہیں ہو پاتا ہے کیوں کہ اردو میں سیٹوں کی دستیابی نہیں ہو پاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جھارکھنڈ میں پانچ فیصد سیٹیں دیگر زبانوں کو دی گئی ہیں جس میں بنگلہ، کھورٹھا، سنسکرت، سنتھالی وغیرہ کی سیٹیں بھر جاتی ہیں اس لیے اردو سبجیکٹ میں سیٹ نہیں مل پاتی۔ آخر میں قاضی شکیل ایکتا نے وزیر تعلیم سے گزارش کی کہ سیٹ کی مجبوری کو ختم کرتے ہوئے دیگر ریاستوں کی طرح بی ایڈ کالج کو چلانے کی اجازت دی جائے اور اقلیتی کالجوں میں 20 فیصد سیٹ اردو کے لیے ریزرو کیا جائے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو ذریعۂ تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت

حیدرآباد (۵ دسمبر)۔ قدیم شہر حیدرآباد میں نونہال اور نوجوان نسل کو تعلیم حاصل کرنے کے کم مواقع کے باوجود تعلیم میں بہترین مظاہرہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر پرانے شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے موثر مواقع فراہم کیے جائیں تو نونہال اپنی تعلیمی قابلیت مزید بہتر بنا سکیں گے جس کے ذریعے معاشی میدان میں حائل رکاوٹوں کو بھی با آسانی دور کیا جا سکے گا۔ اے پی اردو فورم اور معتبر ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ اردو اقلیتی کانفرنس سے خطاب کے دوران جناب شیخ محمد اقبال (کمشنر اقلیتی بہبود آندھرا پردیش) نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ کانفرنس کا آغاز معروف گلوکار خان اطہر نے قومی گیت اور اردو ترانے سے کیا۔ کانفرنس کی صدارت جناب اسماعیل الرب انصاری نے کی۔ چیئرمین ریاستی اقلیتی کمیشن جناب عابد رسول خاں، اراکین قانون ساز کونسل جناب محمد محمود علی، حافظ پیر شبیر احمد، کانگریسی قائدین جناب خلیق الرحمٰن، جناب محمد فیروز خاں کے علاوہ غلام آصف صمدانی اور دیگر نے بھی اس کانفرنس سے خطاب کیا۔ کانفرنس کی کارروائی ڈاکٹر سلیم عابدی نے چلائی اور اردو کی زبوں حالی پر انھوں نے خوب صورت کلام بھی پیش کیا۔ چیئرمین اقلیتی کمیشن جناب عابد رسول خاں نے اردو کی ترقی و ترویج سے متعلق حکومت سے مزید نمائندگیوں کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتی بجٹ میں 25 کروڑ روپے اردو اکیڈمی کو جاری کیے جاتے ہیں جس میں سے اٹھارہ کروڑ روپے سے اردو اکیڈمی کے عملے کی تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں۔ باقی رقم جو اردو کی ترقی کے لیے بچ جاتی ہے، کافی نہیں ہے۔ رکن قانون ساز کونسل محمد محمود علی نے کہا کہ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے اردو ذریعۂ تعلیم اسے شعور نے ریاست کے پندرہ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے عملی جامہ پہنانے پر زور دیا۔

(سیاست، حیدرآباد)

اردو مترجمین نے نئی تنخواہ شرحوں کی مخالفت کی

گورکھپور (۵ دسمبر)۔ اترپردیش اردو مترجمین یونین کے سکریٹری نصرت حسین نے ریاستی حکومت کے ذریعے اردو مترجمین کے لیے جاری کیے گئے نئے اعزازیہ اور عہدوں کو دھوکہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس حکم کو واپس لینے کے لیے ریاستی سطح پر تحریک شروع کی جائے گی۔ نصرت حسین نے کہا کہ سرکاری خدمات شرائط کے مطابق سات سال کی خدمات کے بعد پہلی ترقی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسی طرح سولہ سال کے بعد دوسری اور تیسری چوبیس سال کی خدمات مکمل ہونے کے بعد ترقی دی جاتی ہے۔ اس طرح پوری خدمات کی مدت میں کلرکوں کو چار ترقیاں دی جاتی ہیں لیکن تازہ سرکاری حکم نامے میں اردو مترجمین کے لیے ترقی میں صرف تین مرحلوں کا بندوبست کیا گیا ہے اور چوتھے مرحلے سے انھیں محروم کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چوتھے مرحلے میں تنخواہ 5600 روپے دی جانی چاہیے لیکن اب انھیں 4200 روپے ہی دی جائے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ تنخواہ عام ملازموں کے لیے عام اعزازیہ کے نظریے کے خلاف ہے اس لیے اس کی مخالفت کی جائے گی۔ واضح رہے کہ ریاستی حکومت نے مختلف سرکاری دفاتر میں تعینات اردو مترجمین کے لیے نیا سرکاری حکم نامہ جاری کیا ہے۔ (آگ، لکھنؤ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : رباعیات اکبر
مصنف : اکبر الہ آبادی
مرتب : عادل اسیر دہلوی
ضخامت : 40 صفحات
قیمت : 20 روپے
ناشر : ملک بک ڈپو، 3212 ترکمان گیٹ، دہلی-۶
تبصرہ نگار : ایس اے رحمن

اس مختصری کتاب کے مختصر ابتدایے میں مرتب کتاب نے اکبر الہ آبادی کی زندگی کی پرتوں کو دورشایا ہے تو ان کی شعری کاوشوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہے۔ اکبر الہ آبادی کا شمار بھی اردو کے ان شعرا میں ہوتا ہے جن کی رباعیاں اردو شاعری میں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ رباعی کوئی ایک مشکل فن ہے۔ اس کے لیے گہرے مشاہدے، وسیع تجربے اور شاعرانہ قادرالکلامی کی ضرورت ہوتی ہے۔ رباعی کے چار مصرعوں میں حیات و کائنات کی عکاسی کی جاتی ہے تو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے زندگی کے نشیب و فراز پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے اور مروجہ موضوعات سے ہٹ کر بھی زندگی کے اسرار و رموز کی کامیاب عکاسی کی جاتی ہے۔

رباعی میں جسم و جمال محبوب بھی ابھر سکتا ہے اور زندگی کی مختلف حالتوں اور حرکات و سکنات کو بھی موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ اکبر سماج شناس تھے اور سماج کے ہر طبقے کی خصوصیات سے آگاہ تھے۔ انسانی نفسیات اور ملی و قومی مسائل سے بھی واقفیت تھی۔ ان کے کلام میں چاہے وہ غزلیں ہوں یا قطعات یا رباعیاں اصلاحی اور فلسفیانہ انداز غالب ہے۔ اکبر کی چند رباعیاں دیکھیے اور فن رباعی پر ان کی دسترس اور مہارت کی پذیرائی کیجیے:

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو
اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبر
بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

منکر ہیں روح کے جو یہ اہل غرور
اک امر ہے پوچھنا ہمیں ان سے ضرور
ہے جسم و خرد کا تم کو دعویٰ یہ کہو
پیدا ہوا مادے میں کیوں کر یہ شعور

راحت کا سماں بجز حماقت غفلت بھی ہوئی
حسرت کا کھنچا جو سین عبرت بھی ہوئی
دنیا میں جسے جو پیش آیا اکبر
بس اس کے مطابق اس کی حالت بھی ہوئی

درج ذیل رباعی میں بیٹے کو نصیحت دی ہے:

تحصیل علم کر کہ دولت ہے یہی
اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت
محفوظ ہو معصیت سے عزت ہے یہی

کتاب لیزر کمپوزنگ میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے جس کا سرورق اکبر الہ آبادی کی تصویر سے مزین ہے۔

○○○

نام کتاب : بازدید
مصنف : سید شکیل دسنوی
ضخامت : ۱۲۰ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتا : بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴ (بہار)
تبصرہ نگار : ڈاکٹر رضیہ حامد

سید شکیل دسنوی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے 'دسنہ' جیسی زرخیز سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں جس نے بڑے بڑے علما، شعرا، ادیبوں اور دانش وروں کو جنم دیا۔ عصر حاضر میں سید سلیمان ندوی، پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور سید شہاب الدین دسنوی کے نام خاص ہیں۔

سید شکیل دسنوی سائنس کے طالب علم ہیں۔ سائنس کے ساتھ اردو زبان و ادب سے دل چسپی، ان کے اردو زبان و ادب سے دلی لگاؤ کی غماز ہے۔ ان کے ادبی سفر کی ابتدا شاعری سے ہوئی، تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں 'طفلی ترانے' کے نام سے بچوں کے لیے ان کی کتاب منظر عام پر آئی۔

زیر تبصرہ کتاب 'بازدید' ان کی پہلی نثری تخلیق ہے۔ اس کتاب سے وہ بہ حیثیت تبصرہ نگار متعارف ہوئے ہیں۔ ان تبصروں میں شعری مجموعے، افسانوں کے مجموعے، ڈراموں کے مجموعے، سرگزشت، عروض، سفرنامہ اور تنقیدی مجموعے ہیں جن پر شکیل دسنوی نے تبصرے کیے ہیں، یہ کل ۳۰ ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد شعری مجموعوں کی ہے۔

ان تبصروں میں سے زیادہ تر سہ ماہی 'ادبی محاذ' میں شائع ہو چکے ہیں، ان تصانیف کے قلم کار اور شعرا میں چند کے نام درج ہیں۔ فضا ابن فیضی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، علیم صبا نویدی، اختر شاہجہاں پوری، عروج زیدی، رؤف خیر، پی۔ پی۔ سریواستو رند، سیفی سرونجی وغیرہ۔ شکیل دسنوی نے ان کی نگارشات کو پڑھا، پرکھا اور بہت سنجیدگی سے ان پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے تبصروں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ چند تبصروں کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

☆ ''گلدستۂ خوش باش (مولف اسلم مرزا) ایک عہد ساز شاعر کے فن اور کارناموں کا اعترافیہ ہے۔ ایک مستند دستاویز ہے۔ ولی شناسی کا سرچشمہ ہے اور حال کو ماضی سے روشن کرنے کا ہنر پیش کیا ہے'' (ص ۱۹)

☆ ''ماہر عروضیات ڈاکٹر عثمان نے چودہ صنفوں کی سخت ریاضت اور چلہ کشی کے ذریعے عروض جن کو اپنا تابع کرلیا اور خلیل بصری کے عروضی نظام کو جناتی سائے سے آزاد کر کے بے حد سہل اور عام فہم انداز میں شائقین فن کے سامنے کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ یہ نقش سلیمانی اب ہر شخص کی دسترس میں ہے''۔
(عروض خلیل منتقی اردو از عثمانی، ص ۴۲)

☆ ''ایم۔ اے۔ حق جزری سے کہانی بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے اسے محض تخیل کی کرشمہ سازی ماننے کو قاری کا جی نہیں چاہتا۔ ان کا کمال تو یہ ہے کہ ہر بات کو واقعے سے زیادہ سچا بنا کر پیش کرنے کا ہنر آزماتے ہیں۔ یہی انفرادیت ان کی اپنی شناخت مستحکم کرتی ہے''۔
(نئی صبح، ص ۱۱۳)

☆ ''علیم صبا نویدی نے اس مغربی صنف سخن (سانیٹ) میں خالص مشرقی موضوع یعنی نعت کو ہم آمیز کر کے شراب دوآتشہ کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے''۔ (نور السماوات، ص ۹۰)

سید شکیل دسنوی کے تحریر کردہ تبصروں سے قاری بیک وقت نظم و نثر کی کتب سے واقفیت حاصل کرنے کے ساتھ اس صنف کے بارے میں شکیل دسنوی کے تحریر کردہ افکار و خیالات سے مستفید ہوتا ہے۔ کتاب دیدہ زیب اور صاف ستھری طبع ہوئی ہے۔

○○○

بقیہ: خواجہ حسن نظامی

صفحہ ۸ سے آگے

خواجہ صاحب نے اُس زمانے میں بہت اچھے اچھے مضامین لکھے۔ محمد ارتضیٰ صاحب کو خواجہ صاحب نے 'ملا واحدی' کا خطاب دیا جو اتنا مشہور ہوا کہ آج واحدی صاحب کو سب جانتے ہیں اور محمد ارتضیٰ کو کوئی نہیں جانتا۔ واحدی صاحب کی دولت اور خواجہ صاحب کی عقل نے مل کر بہت بڑے بڑے کام کیے۔ روپیہ لگانے والے خواجہ صاحب کو ہمیشہ مل جاتے تھے۔ واحدی صاحب کی طرح خواجہ صاحب کے ایک اور بہت بڑے قدرداں بھیا احسان تھے جو میرٹھ کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں بھی علم و ادب کا بہت شوق تھا۔ ان کا ایک اخبار بھی نکلتا تھا، اسی اخبار کے سلسلے میں خواجہ صاحب سے ان کے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ کانپور کی مسجد کا جب پہلی دفعہ ہنگامہ ہوا تو خواجہ صاحب میرٹھ ہی میں تھے اور انھوں نے ایک بہت بڑے جلسے میں ایسی دھواں دھار تقریر کی کہ مسلمانوں میں جوش و خروش پھیل گیا۔ اس تقریر سے خواجہ صاحب کی بہت شہرت ہوئی۔ بھیا احسان اور واحدی صاحب سے خواجہ صاحب کے تعلقات قیام پاکستان تک نہایت مخلصانہ رہے۔ پاکستان بننے کے بعد خواجہ صاحب تو دلی ہی میں رہ گئے اور بھیا احسان اور واحدی صاحب کراچی چلے آئے۔ یہاں آکر جو حال اور سب مہاجروں کا ہوا وہی ان کا بھی ہوا۔

روایت عام کے مطابق خواجہ صاحب کے تین لاکھ مرید تھے۔ ہندو اور عیسائی بھی ان کے مرید تھے۔ ایک اطالوی شہزادی بھی ان کی مرید تھی۔ فرماتے تھے کہ برنارڈ شا بھی میرا مرید ہے اور پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہشتم) نے بھی میرے مریدوں میں شامل ہونے کے لیے مجھے چٹھی لکھی ہے۔

خواجہ صاحب کو خطابات دینے اور نام رکھنے کا عجب سلیقہ تھا۔ علامہ راشد الخیری کو 'مصور غم' خواجہ صاحب ہی نے خطاب دیا تھا۔ میرے والد کو 'وارث الادب' کہتے اور لکھتے تھے۔ خود مصور فطرت تھے۔ ان کی بیگم خواجہ بانو ہیں۔ ایک بیٹی حور بانو اور دوسری روحہ۔ ضیاء الدین احمد کو ان کی تاریخی معلومات کی وجہ سے برنی خطاب دیا تھا۔ کوئی ناسوتی نظامی تھے اور کوئی ابن عربی۔ ایک صاحب خلسار نظامی کہلاتے تھے۔ بھیا احسان کشتی شاہ تھے۔ ایک صاحب مستری مشتی کہلاتے تھے۔ کوئی جمالی تھا کوئی غزالی۔ ایک تھے قلندر نظامی۔ یہ قلندر نظامی بھی عجیب چیز تھے۔ ان کی وضع قطع خواجہ صاحب سے مشابہ تھی، بلکہ کہا جاتا تھا کہ خواجہ صاحب کی اُترن انھی کو ملتی ہے۔ وہی چپلی ٹوپی، وہی جبہ، کالمبیں کھنچی ہوئیں۔ عمر میں خواجہ صاحب سے بڑے تھے۔ بہت غریب آدمی تھے۔ وضع دار ایسے کہ سوائے خواجہ صاحب کے اخباروں کے اور کسی کا اخبار نہ بیچتے تھے۔ دلی والے کہتے تھے کہ خواجہ صاحب کو پیر و مرشد بنانے میں قلندر نظامی نے بڑا کام کیا ہے۔ روایت مشہور تھی (اور اکثر غلط روایتیں بھی زیادہ مشہور ہو جایا کرتی ہیں) کہ قلندر نظامی کا کام ہی یہ تھا کہ خواجہ صاحب کو سجدے کرتے رہیں۔ یہ سجدے بڑے خضوع و خشوع سے کیے جاتے تھے اور دیکھنے والے ان سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان کا فی سجدہ کچھ مقرر تھا۔ اس طرح قلندر نظامی نے کافی رقم کمائی۔ خیر ہم نے تو یہ دیکھا کہ قلندر نظامی بہت ضعیف ہو گئے تھے اور کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ خواجہ صاحب ہی کچھ سلوک کرتے تھے جو ان کی زندگی کے آخری دن تیر ہوتے تھے۔

خواجہ صاحب جدت طرازیوں کے دلدادہ تھے۔ عیسوی، ہجری، فصلی سنوں کے مقابلے میں انھوں نے اپنا ایک سن وضع کیا تھا۔ بارہ مہینوں کے نام بارہ اماموں پر رکھے تھے اور سات دنوں کے بھی مقدس نام تجویز کیے تھے۔ اپنی بعض کتابوں کے نام بھی عجیب و غریب رکھے تھے۔ 'کم تو موت'، 'قرام قبلہ و شملہ'، 'طمانچہ بر رخسار یزید'، 'کانا باتی'، 'مرشد کو سجدۂ تعظیم' وغیرہ۔ (باقی آئندہ)

●●●

بقیہ:

مصحفی: امروہہ، آنولہ، دلی...

صفحہ ۲ سے آگے

''شیخ ولی محمد یہاں (کالی پگڑی) سکونت رکھتے تھے جن کے بیٹے شیخ غلام ہمدانی شعر گوئی میں استاد اعلیٰ مصحفی تخلص شاگرد میاں مانی کے تھے۔ ناسخ و آتش اور ذکی وغیرہ ایسے شاعروں کو ان سے تلمذ تھا، لکھنؤ میں جاکر مقیم ہوئے، وہیں قضا کی۔''[۱۴]

'تاریخ اصغری' مصحفی کی وفات کے اکیاون برس بعد لکھی گئی جس میں امروہہ کی تاریخ ہے۔ اس میں مصحفی کی ولادت اور آبائی وطن امروہہ ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ نورالحسن نقوی نے اپنی کتاب میں اس کتاب کے کچھ اقتباسات حوالے کے طور پر پیش کیے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اس کتاب میں وطن اور ولادت کے سلسلے میں ٹھوس ثبوت پیش کیے گئے ہیں۔ نقوی صاحب اسے مستند قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخ اصغری کا سنہ تالیف ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۳ء، تالیف کے ۱۵ سال بعد یہ کتاب شائع ہوئی۔ جب یہ کتاب لکھی گئی تو مصحفی کی وفات کو صرف پچاس برس گزرے تھے۔ گویا اس وقت ایسے بزرگ موجود رہے ہوں گے جنھوں نے مصحفی کو امروہہ میں دیکھا ہوگا۔''[۱۵]

مصحفی نے اپنے تذکرے 'ریاض الفصحا' میں لکھا تھا کہ ان کے حسب نسب کے احوال 'مجمع الفوائد' سے معلوم ہوں گے۔ پنڈت دتاتریہ کیفی کے پاس 'مجمع الفوائد' کا صرف ایک مخطوطہ تھا جو انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کو عطا کردیا تھا جس کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ نے حاصل کرلی تھی، بعد میں 'مجمع الفوائد' کو شائع کیا گیا۔ 'مجمع الفوائد' کے کچھ اقتباسات جو مصحفی کے سوانح سے متعلق ہیں یہاں پیش کیے جاتے ہیں، ان کا ترجمہ ڈاکٹر خلیق انجم نے کیا ہے:

''موضع مجھولی اور شیخ پورہ کے درمیان ایک موضع اکبر پور آباد ہے۔ اس موضع میں میرے بزرگوں کی سکونت تھی۔ موضع ہزارہ اور مکانو کے رہنے والوں نے اپنی پرانی دشمنی کی وجہ سے اس موضع کے لوگوں کو قتل کردیا۔ عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کردیا گیا۔ ان عورتوں میں شیخ نظام کی والدہ بھی تھیں۔ انھوں نے الفت و رزی کی وجہ سے اس چھوٹے سے بچے کو اپنے ہاتھوں سے بھس کی ایک کوٹھری میں ڈال کر چھپا دیا اور خود دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوگئیں۔ لیکن خدا کا کرم ایسا ہوا کہ آگ اور شعلوں نے اس بچے کی نگہبانی کی۔ موضع شیخ پورہ کی ایک بوڑھی خاتون مقتولوں کو دیکھنے یہاں آئی۔ اس کی نظر دودھ پیتے بچے پر پڑی جو اپنے انگوٹھے کو پستان مادر سمجھ کر چوس رہا تھا۔ اس عورت نے اس بچے کی پرورش کی۔ یہاں تک کہ اتنا زمانہ گزر گیا کہ بچے کی عمر بارہ سال ہوگئی۔ ایک دن وہ بچہ محلے کے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کچھ بچوں نے اُسے بتایا کہ تم فلاں موضع کے رہنے والے ہو۔ اُسے بہت حیرت ہوئی۔ جب گھر آیا تو جس عورت نے اس کی پرورش کی تھی، بچے نے اس سے پوچھا کہ میرے ماں اور باپ کون ہیں اور میں کس کا بیٹا ہوں۔ بوڑھی عورت نے اس کو اصل قصہ سنایا۔ یہ سن کر وہ رات بھر غصے میں کروٹیں لیتا رہا۔ صبح کو ہر ایک کی نظر سے بچ کر دکن کی طرف چلا گیا۔ جب وہ سلامتی سے منزل مقصود پر پہنچ گیا تو ایک سقہ کے گھر مقیم ہوگیا۔ سقے نے مہمان داری کے لوازم کے طور پر اس کی عزت کی اور اپنے گھر میں اسے جگہ دے دی۔ کچھ ہی دن میں اس خاندان سے اس لڑکے کو اتنی قربت حاصل ہوگئی کہ وہ سقہ اس بچے کو اپنی اولاد کی طرح سمجھنے لگا۔ سقہ ایک سادات عالی کے گھر میں پانی بھرتا تھا۔ کچھ دن بعد سقے نے پانی سے بھری ایک مشک اس بچے کے کندھے پر لٹکائی اور بچے کو اس محل میں لے گیا۔ بچے کی پیشانی پر شرافت کی چمک اور نور سعادت کی روشنی دیکھ کر اس کے گھر کی خاتون سیدہ نے بچے سے اس کے حالات دریافت کیے اور پوچھا کہ تم کس کے لڑکے ہو؟ لڑکے نے بتایا کہ وہ سید زادہ ہے۔ سیدہ نے بڑی منت و سماجت سے سقے سے اس بچے کو لے لیا اور اپنا بیٹا بنا لیا۔ اُسے بہت شاندار کپڑے پہنا کر ایک استاد کے پاس بھیج دیا اور مکتب میں داخل کروا دیا۔ کچھ سال بعد یہ بچہ جوان ہوگیا۔ علم و فضل کے زیور سے آراستہ ہوگیا اور اس نے تمام علوم آداب، فوائد تہذیب پر دسترس حاصل کرلی تو اس کے ہم عصر اس سے حسد کرنے لگے۔ سیدہ کی ایک بہت خوب صورت بیٹی تھی۔ سیدہ نے بیٹی کی شادی اس لڑکے سے کردی۔ اس لڑکے کا نام شیخ نظام تھا۔ شیخ نظام کے دادا راجپوت تھے۔ اس لڑکے یعنی شیخ نظام کے والد مسلمان ہوگئے تھے۔''[۱۶]

''ہندوستان کے کچھ مطربوں نے جب دکن میں شیخ نظام کے عروج کے بارے میں سنا تو وہ دکن پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے شیخ نظام کے بزرگوں کی تعریف کی اور مصحفی کے خاندان کے بارے میں بتایا جس کی وجہ سے ان لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ یہ نوجوان تو مسلم ہے۔ سیدہ کے بیٹے چاہتے تھے کہ شیخ نظام کو قتل کردیں لیکن ان کی والدہ نے روک دیا اور کہا جو ہونا تھا ہوگیا۔ میں شیخ نظام کو ان کے وطن واپس بھیج دیتی ہوں۔ کچھ دن بعد شیخ نظام کو ان کے وطن واپس بھیج دیا گیا۔ شیخ نظام دولت و حشمت اور بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ وطن کے لیے روانہ ہوگئے۔ شیخ نظام کے آنے کی خبر سن کر دشمنوں کے علاقوں پر خوف طاری ہوگیا۔ جب شیخ نظام اپنے گاؤں پہنچے تو قوم 'راکھڑ' کے ایک شخص نے اپنی بیٹی شیخ نظام کی پینس میں سوار کردی۔ شیخ نظام نے اپنی سیدہ بیوی سے دریافت کیا کہ اب وہ کیا کریں؟ سیدہ نے کہا اس عورت کو رکھ لو۔ اس 'راکھڑ' سے بہت سے بچے پیدا ہوئے لیکن شیخ نظام افسوس کرتے کہ سیدانی کے بطن سے کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی۔ بی سیدانی نے شیخ نظام سے کہا، میرے بطن سے تمھاری کوئی اولاد نہیں ہوگی۔ کسی دوسری قوم کی لڑکی سے نکاح کرلو۔ شیخ نظام نے بی سیدانی کے کہنے پر 'پنی' قوم کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ وہ حاملہ ہوگئی اور اس سے لڑکا پیدا ہوا۔ ماں بننے کے بعد وہ عورت خود کو سیدانی سے بہتر سمجھنے لگی۔ سیدانی نے اس عورت کو بد دعا دی جس کی وجہ سے وہ لڑکا مرگیا۔ کچھ عرصے بعد اس عورت کا بھی انتقال ہوگیا۔ تمام لوگوں پر سیدانی کی کرامات ظاہر ہوگئیں۔ سب اس سے خائف رہنے لگے۔ شیخ نظام بھی سیدانی کی پہلے سے زیادہ عزت کرنے لگے اور ان سے ڈرنے لگے۔ سیدانی کے حکم کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ بعد میں سیدانی نے شیخ نظام کو خود اپنی قوم میں نکاح کی اجازت دے دی۔ شیخ نے شادی کرلی اور خدا کے حکم سے وہ لڑکی بھی حاملہ ہوگئی اور اس کے بطن سے بھی لڑکا پیدا ہوا۔ ماں نے لڑکے کو سیدانی کے قدموں میں ڈال دیا۔ بی سیدانی نے بچے کی کمر پر دست شفقت پھیرا اور کہا یہ بچہ میرا ہے اور تو اس کی دایہ ہے اسے دودھ پلا اور اس کی پرورش کر۔''[۱۷]

مصحفی نے 'مجمع الفوائد' میں اپنے بھائیوں، ان کے ازدواج اور ان کی اولاد کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ مصحفی اپنے چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ بڑے بھائی کا نام غلام جیلانی تھا جو تیس سال کی عمر میں ہی انتقال کرگئے۔ دوسرے بھائی کا نام غلام یزدانی تھا، وہ چھوٹی عمر ہی میں انتقال کرگئے۔ ان کے یہاں کئی بچے پیدا ہوئے لیکن دو لڑکے زندہ رہے جن میں ایک جوانی میں مرگیا اور دوسرے کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ تیسرے بھائی کے یہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ تیسرے بھائی بھی جلد انتقال کرگئے۔ مصحفی چوتھے نمبر پر تھے۔ مصحفی کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی لیکن درد زہ کی تکلیف میں بیوی کی موت ہوگئی۔ کچھ مدت کے بعد لڑکی بھی داغ مفارقت دے گئی۔ اس کے بعد کئی عورتیں ان کے یہاں آتی جاتی رہیں، لیکن کوئی اولاد نہ ہوئی جس سے ان کے خاندان کا سلسلہ جاری رہتا۔ 'مجمع الفوائد' میں مصحفی نے اپنے بھائیوں اور ان کے ازدواج و اولاد کے بارے میں تو تفصیل سے لکھا لیکن اپنے آبا و اجداد کے بارے میں صاف صاف نہیں تحریر کیا، مثلاً نہیں بتایا کہ ان کے بزرگ امروہہ میں کب اور کیوں آئے۔ ان کے والد نے کہاں زندگی بسر کی، ان کا کیا پیشہ تھا؟ کہاں دفن ہوئے؟ اس لیے اس سلسلے میں صرف تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں کے بیانات پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

(باقی آئندہ)

ooo

یادِ رفتگاں

پہلی قسط

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی کا یہ معرکہ آرا خاکہ شاہد احمد دہلوی نے لکھا تھا جو ان کی کتاب 'چند ادبی شخصیتیں' میں بھی شامل ہے۔ شاہد احمد دہلوی ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے۔ ان کا رسالہ 'ساقی' اردو کے ان چند رسالوں میں شمار کیا جاتا تھا جن سے اردو کی ادبی صحافت کو معیار اور وقار حاصل ہوا۔ شاہد احمد دہلوی کی شخصیت دہلی کے تمام نشیب و فراز کی سب سے نمائندہ شخصیت تھی۔ یوں تو ان کا ہر خاکہ بے حد اہم ہے اور مقبول بھی، لیکن خواجہ حسن نظامی پر ان کے اس خاکے کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں وہ دلی اپنے پورے بانکپن کے ساتھ نظر آتی ہے جس کو عالم میں انتخاب کہا جاتا تھا۔ اس خاکے کے یہاں نقل کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ نئی نسل اس قصۂ پارینہ کو شاہد احمد دہلوی کی آنکھوں سے دیکھ سکے اور اردو نثر کے جادو سے بھی آشنا ہو سکے۔ (ادارہ)

شاہد احمد دہلوی

حضرت خواجہ حسن نظامی دلی کے ان بزرگوں میں سے تھے جنھیں زمانہ کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ وہ ایک بہت غریب گھر میں پیدا ہوئے۔ افلاس کی وجہ سے ان کی تعلیم نہ ہو سکی، مگر انسان کو انسان بنانے میں صرف تعلیم ہی تو کارآمد نہیں ہوتی۔ یوں لادنے کو تو گدھے پر بھی کتابیں لاد دی جاتی ہیں لیکن گدھا تو گدھا ہی رہتا ہے۔ اصل چیز ہے تربیت۔ خواجہ صاحب حضرت نظام الدین اولیا کے خواہر زادوں کی اولاد میں سے اپنے آپ کو بتاتے تھے۔ ان کی شرافت نفسی نے انھیں سنبھالے رکھا۔ ان کے والد بھی درگاہ محبوب الٰہی کے خادموں میں شامل تھے۔ درگاہ کی آمدنی میں سے حصہ رسد انھیں بھی کچھ مل جاتا۔ یہ بانٹ اس قدر قلیل تھی کہ اس میں جسم و جاں کا رشتہ بہ مشکل قائم رکھا جا سکتا تھا۔ تاہم غیور والدین نے اپنے لڑکے کو کچھ ایسی تربیت دی کہ مفلس و قلاش ماں باپ کا بیٹا بعد میں دلی کے گنے چنوں میں شمار ہوا۔ ادب میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا ادیب کہلایا۔ علوم دینی میں وہ بصیرت حاصل کی کہ فرنگی حکومت نے شمس العلما کا خطاب دیا۔ معاملات روحانی میں اتنی ترقی کی کہ تین لاکھ مریدوں کا مرشد کامل بنا۔ مبلغ اسلام بنا تو اچھوتوں سے لے کر راجہ مہاراجاؤں تک کو حلقہ بگوشان اسلام میں لا شامل کیا۔ سیاست میں قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے صف اول کے لیڈروں میں جا پہنچا۔ غرض زندگی کے ہر شعبے میں حیرت ناک ترقی کی...

میں نے جب سے ہوش سنبھالا خواجہ صاحب کو ایک ہی سا دیکھا۔ انھیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ زمانے کی گردش رک گئی ہے۔ آخر آخر میں ان کی داڑھی میں چند سفید بال البتہ آگئے تھے ورنہ خود ان میں سرمو فرق نہ آیا تھا۔ لمبا اونچا قد، چھریرا بلکہ دُبلا بدن، سر پر کلاہ نما چپٹی ٹوپی، لمبا سا چغہ، بڑے پائنچوں کا پاجامہ، پاؤں میں دیسی جوتی، رنگ شہابی، چہرہ کتابی، آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، جس میں سے آنکھیں ہیرے کی طرح جگر جگر چمکتی تھیں، موزوں دہانہ، لب ذرا موٹے، کتروان لبیں، گھنی بھر پری داڑھی، صراحی دار گردن، شانوں پر پٹے کالے ناگوں کی طرح لہراتی اور ناگنی کی طرح بل کھاتی۔ چلتے تو کڑی کمان کے تیر کی طرح، بیٹھتے تو لاکھوں من کے بیٹھے معلوم ہوتے۔ خاموشی میں پہاڑ کا سکوت ہوتا اور گفتگو میں دریا کی سی روانی۔ خوش گفتار ایسے کہ بات کرتے میں منہ سے پھول جھڑتے، سننے والے دھیان کا دامن پھیلا کر انمول پھولوں سے اپنے من کی جھولیاں بھر لیتے۔ کوئی خوش مذاقی کی بات بھی کرتے تو خندہ دنداں نما سے آگے نہ بڑھتے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے طوطی کی طرح چہکتے رہتے۔ کیا مجال جو کسی اور کو ان کے آگے لب کشائی کا یارا ہو۔ بڑوں میں بڑوں کی سی باتیں کرتے اور بچوں میں بچوں کی سی۔ تمام علوم ظاہری و باطنی میں درک رکھتے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں دین اور ایک ہاتھ میں دنیا تھی۔ طرفہ طبیعت کے آدمی تھے۔ دلی سے ان کا نام اس طرح پیوست ہے جس طرح گوشت سے ناخن۔ اس عجیب و غریب ہستی پر میرا کچھ لکھنا چھوٹا منہ بڑی بات۔ دوسرے یہ کہ خواجہ صاحب کے متعلقین میں سے نہیں، دوستوں میں سے نہیں، وہ میرے والد کے ملنے والوں میں سے تھے۔ میرے بزرگ اور محترم تھے۔ اکثر انھیں دیکھا اور چند بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا بھی موقع ملا۔ یوں ساری عمر ان کے رسالے، اخبار، کتابیں اور روزنامچے پڑھتا رہا اور ان کی انشائیہ اردو کے مزے لیتا رہا۔ گزشتہ تیس سال کے چند ناقابل فراموش تاثرات ہیں جو ناظرین کی دلچسپی کے لیے لکھتا ہوں، شاید ان میں سے کوئی ایسا ہو جو مستقبل کے مورخ کے کام آ جائے۔ میں صرف ایک واقعاتی مرقع پیش کر رہا ہوں۔

خواجہ صاحب کی اخباری زندگی کا آغاز پھیری پر کتابیں اور اخبار بیچنے سے ہوا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کی بے خواب راتیں گزری ہیں۔ انھوں نے بھوک اور افلاس کا مزہ بچپن ہی میں چکھ لیا تھا۔ اگر ان میں غیرت نہ ہوتی تو وہ بھی کنگلوں کی طرح اپنی زندگی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گزار دیتے۔ یہ ان کے خاندانی شرف کا جوہر ہی تھا جو انھیں ان کی پستی کا احساس دلاتا رہا اور اس گری ہوئی زندگی پر وہ قانع نہ ہو سکے۔ ان کے دل میں ہمیشہ سے ایک بڑا آدمی بننے کی امنگ تھی۔ دلی کے چوک اور دلی کی گلیوں ہی میں انھوں نے تعلیم پائی۔ یہی وہ مکتب تھے جن میں انھوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی حاصل کیا۔ ناموافق حالات نے انھیں سخت کوش بنا دیا۔ وہ ہمت کے پر لگا کر اڑے اور شہرت کے آسمان پر کامیابی کا تارا بن کر چمکے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو خواجہ صاحب نے اچھے سیکڑوں ہی اخبار جاری کیے۔ روزانہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہانہ۔ یہ سب پرچے شہاب ثاقب کی طرح مطلع صحافت پر نمودار ہوتے۔ اپنی خیرہ کن چمک دمک دکھاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں گھل جاتے۔ ان کا اخبار 'منادی' صرف ایک ایسا پرچہ ہے جو بیسیوں چولے بدلنے پر بھی شائع ہوتا رہا اور اس کے شائع ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں خواجہ صاحب کا دل چسپ روزنامچہ شائع ہوتا رہا۔ یہ روزنامچے کی جدت خواجہ صاحب کے غیر معمولی دماغ کی پیداوار تھی۔ صبح سے رات تک کے واقعات اس میں درج ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ روزنامچہ کا مقصد محض خواجہ صاحب کا ذاتی پروپیگنڈا تھا، لیکن اس کی مقبولیت کا سبب وہ زبان اور بیان تھا، وہ انداز تحریر جو خواجہ صاحب کے ساتھ پیدا ہوا اور خواجہ صاحب ہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ یہ سیدھا سادا انداز بیان ہزار کوشش پر بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس کی سادہ پُرکاری کا کمال ایک عالم ہے۔ سر عبدالقادر کے 'مخزن' سے لے کر آج کل کے عمدہ ادبی رسالوں تک شاید ہی کوئی ایسا ہو جو خواجہ صاحب کے مضامین شائع کرنے کو اپنے اعلا کارناموں میں شمار نہ کرتا ہو۔

دلی کے خاص لوگوں میں سے ایک صاحب ہیں محمد ارتضیٰ، جو کوچہ چیلان میں رہتے تھے اور دلی کے اچھے آسودہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ خاصے متمول آدمی تھے، جائداد بھی کافی تھی۔ عربی، فارسی اور اردو سے شغف رکھتے تھے۔ طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا۔ ہم نے ہمیشہ سے ان کے منہ پر چھوٹی سی داڑھی دیکھی۔ داڑھی کیا تھی داڑھی کی معذرت تھی۔ ادب سے دلچسپی کی وجہ سے ان کا تعلق گزشتہ چالیس پینتالیس سال پہلے کے تمام اچھے ادیبوں اور شاعروں سے رہتا تھا۔ ان میں علامہ راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتح پوری جیسے جلیل القدر ادیب شامل تھے۔ ان صاحب سے خواجہ صاحب کا تعلق دوگونہ تھا۔ ایک تو ادب کا اور دوسرے مذہب کا۔ ارتضیٰ صاحب نے بھی کئی رسالے نکالے جن میں 'درویش' بہت مشہور ہوا۔ خواجہ صاحب نے جب 'حلقہ مشائخ' نواب بڈھن کے کمرے پر قائم کیا تو 'نظام المشائخ' کے نام سے محمد ارتضیٰ صاحب نے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اس پرچے میں جہاں اہل سلوک کے مسائل پر مضامین ہوتے تھے وہاں اعلا درجے کے ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org